ثقافت اور تہذیب

ڈاکٹر سید اسلام شاہ

ثقافت کا مفہوم

ثقافت کی تعریف کرنا قدرے مشکل کام ہے ٹیلر نے ثقافت کی تعریف یوں کی ہے'' ثقافت انسان کے علوم، ادب، عقائد، اخلاق، قانون، رسم ورواج اور اس کی دیگر معاشرتی سرگرمیوں کے مجموعہ کا نام ہے'' پروفیسر میکائیور (Maciver) کے نزدیک ہماری طرز زندگی ہماری ثقافت ہے''[1] انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں مادی اور روحانی ظاہری اور باطنی خارجی اور نفسیاتی، ہماری زندگی کا جو پہلو روحانی، باطنی، اور نفسیاتی نوعیت کا ہے اس کی کئی ایک خواہشات اور ضروریات ہیں جن کی تکمیل کے لیے ہم مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں درحقیقت ہماری ثقافت ہیں۔ ہم نے زندگی کے سربستہ رازوں کو جاننے کے لیے فلسفہ اور مذہب کی طرف رجوع کیا جس سے ہماری روح کو اطمینان ہوا۔ ہم نے اپنے لطیف احساسات کی تسکین کے لیے موسیقی، شاعری، مصوری، ادب اور مختلف فنون کو تخلیق کیا۔ ہماری یہ تمام سرگرمیاں ثقافت کے نام سے موسوم ہیں۔ گویا ثقافت کا تعلق ہماری نفسیاتی اور اندرونی زندگی سے ہے جس کا مقصد انسانی اقدار کا فروغ اور اس کی طرز زندگی میں حسن اور نکھار پیدا کرنا ہے۔ انسان ایک خاص مزاج رکھتا ہے جس کے اطمینان کا سامان ثقافت ہے۔ اپنی مخصوص ثقافت کی بناء پر انسان دوسری مخلوقات سے اپنے آپ کو افضل سمجھتا ہے اس کے ذہن کی پختگی اور شعور کی بلندی سے مسلسل ثقافتی ورثہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ثقافت انسانیت کی علامت ہے اور روح کو بالیدگی اور آسودگی فراہم کرتی ہے۔

ثقافت کی تعریف

بہت سے مفکرین نے ثقافت کی مختلف تعریفیں کی ہیں چند مشہور تعریفیں درج ذیل ہیں۔ ای بی ٹائلر

(E.B.Tylor) نے لکھا ہے کہ ''ثقافت ایک ایسی اجتماعی سیاست کا نام ہے جس میں علم، عقائد، فن، اخلاق، قانون، رسم ورواج کے علاوہ تمام صلاحیتیں اور عادتیں شامل ہیں جو انسان، معاشرے کا ممبر ہونے کی حیثیت سے حاصل کرتا ہے''۔ میک آئیور (Maciver) نے ثقافت کی اس طرح تعریف کی ہے انسان جو طرز عمل اختیار کرتا ہے اس کا نام ہی ثقافت ہے۔ لنٹن (Linton) کا خیال ہے کہ ثقافت سماجی ورثہ کا نام ہے گو یا لنٹن کا خیال ہے کہ اس چیز کو جو انسان آباؤ اجداد سے حاصل کرتا ہے ثقافت کہلائے گی۔ سدر لینڈ اور وڈ ورڈ (Suther Land and woodward) نے لکھا ہے کہ ''ثقافت ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچائی جا سکے گی''۔ ہاب ہاؤس (Hob House) کا خیال ہے کہ ''ہر وہ شے جو افراد کے جذبات اور احساسات سے وجود میں آئے ثقافت ہے''۔ میلی نوسکی (Mali Nowski) نے لکھا ہے کہ ''زندہ رہنے کے مجموعی سلیقے کا نام ثقافت ہے جو ہر قسم کے ذہنی، معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہے''۔[۲] بی۔ جے۔ کوہن (B.J.Cohen) کے مطابق ثقافت کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ ''ثقافت کسی مخصوص معاشرے کے افراد کے اکتسابی کردار اور اعتقادات کا نام ہے''۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ ''ثقافت میں مذہب، عقائد، رسم و رواج معاشرت، مادی وسائل وضروریات اور زندگی کے سارے عوامل شامل ہیں''۔[۳] پروفیسر ایڈورڈ ٹائمنر (Professor Edward Times) کے مطابق ''کلچر کا تعلق ہر قسم کے علوم وفنون، رسم ورواج، عقائد اور قوانین سے ہوتا ہے یا پھر انسان کے فکر و عمل سے''۔ مارلے (Morley) کا خیال ہے کہ ''ثقافت ایسے احساس کا نام ہے جو انسان میں باہمی مفاہمت اور مقبولیت پیدا کرے''۔ کون (Coon) کہتا ہے کہ ''انسان کے رہن سہن کے اصولوں کے مجموعے کو ثقافت کہتے ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں''۔ ان تعریفوں پر غور کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح واضع ہو جاتی ہے کہ ''انسان معاشرے کے رکن کی حیثیت سے جو کچھ حاصل کرتا اور آئندہ نسلوں کو منتقل کرتا ہے وہ سب کچھ ثقافت کہلاتا ہے اس میں علم، فن، عقائد، نظریات، قانون، رسم و رواج، مذہب،

ادب، موسیقی، مصوری وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔ [۴]

تہذیب کا مفہوم [۵]

تہذیب انسانی زندگی کے دوسرے رخ سے متعلق ہے مثلاً ہماری ظاہری اور مادری ضروریات کی تسکین کا سامان ہے۔ تہذیب انسان کی مہذب زندگی کا آئینہ ہے اور تہذیب کی وساطت ہی سے انسان کو حیوان سے ممیز کیا جاتا ہے۔ کانٹ کے نزدیک تہذیب ہمارے بیرونی افعال سے متعلق ہے۔ پروفیسر مکائیور کے خیال میں ''تہذیب سے مراد وہ تمام ساز و سامان ہے جو انسان مادی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جس میں معاشرتی زندگی کی تنظیم بھی شامل ہے''۔ انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے کئی مادی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مادی اشیاء کے حصول اور ان میں ردو بدل تہذیب ہے۔ تہذیب کا بنیادی تصور ہماری معاشی ضروریات سے وابستہ ہے۔ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہم نے جدو جہد سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تہذیب کے دائرہ میں آتا ہے۔ ہماری زراعت، صنعت، سیاست، اور معاشرت تہذیب کے مختلف شعبے ہیں۔ ہماری ضروریات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جن کو پورا کرنے کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے نہ صرف ہماری ضروریات بڑھی ہیں بلکہ ہم آرام و آسائش کے بھی زیادہ دلدادہ ہو گئے ہیں۔ لہذا ہم نے اپنے آرام و آسائش کے لیے جو اشیاء تیار کی ہیں وہ بھی تہذیب ہی کا حصہ ہیں۔ مثلاً ہوائی جہاز، ائیر کنڈیشننگ اور ٹیلی فون وغیرہ۔ تہذیب کا تعلق ہمارے جسم اور بدن سے ہے دوسرے الفاظ میں جو کچھ ہمارے جسم کی خواہش ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے ہماری سرگرمیوں کا ثمر تہذیب ہے۔ انسان کی مسلسل جدو جہد اور اس کی معلومات میں اضافہ کے باعث ہماری تہذیب میں آئے دن نئے سرمائے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جب سے انسان تہذیب یافتہ ہوا ہے اس نے پرامن اور متمدن زندگی کا آغاز کیا ہے اور اس کی دلچسپی زندگی میں بڑھتی رہی ہے۔ تہذیب سے پہلے کے دور میں انسان حیوان کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ پہاڑوں کی

غاروں میں رہتا، اخلاق اور قانون سے نا آشنا تھا۔ سیاست معیشت اور معاشرت کے اصولوں سے ناواقف تھا۔ نہ اس کے پاس انتظامی مشینری تھی اور نہ ہی اس کی بیشتر ضروریات کو پورا کرنے کا موزوں ذریعہ تھا۔ تہذیب نے انسان کو زندگی میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔

تہذیب اور ثقافت میں فرق

تہذیب اور ثقافت مادی، معاشرتی اور اخلاقی قوتوں کا نام ہے جن کے بغیر انسان کی تمدنی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ انسان بیک وقت تہذیب اور ثقافت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تاہم ان دونوں اصطلاحوں میں جو فرق ہے وہ حسب ذیل سطور میں واضح کیا جاتا ہے۔ [۲]

۱۔ ثقافت کا تعلق ہماری روح، دل اور مزاج سے ہے جب کہ تہذیب ہماری جسمانی اور مادی ضروریات سے متعلق ہوتی ہے مثلاً لباس پہننا تہذیب ہے کیونکہ یہ ہمارے جسم کو سردی اور گرمی سے محفوظ کرتا ہے۔ لباس کی شکل وشباہت ثقافت ہے کیونکہ لباس کی بناوٹ ہمارے عقائد، رسوم ورواج اور نظریات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ پکا ہوا کھانا تہذیب کی علامت ہے جو ہمیں زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے جب کہ اس میں مختلف ذائقے پیدا کرنا ہماری ثقافت ہے کیونکہ یہ ہماری پسند اور مزاج کا تقاضا ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مکانات، لباس، موٹریں، مشینی آلات، بجلی، زراعت، صنعت اور سیاست ہماری تہذیب کا شاہکار ہیں جب کہ فلسفہ وسائنس علم وادب مذہب وعقیدہ، شعر وشاعری، مصوری اور مجسمہ سازی ثقافتی ورثہ ہیں۔

۲۔ ہماری تہذیب بتدریج ترقی پذیر ہے مثلاً بیل گاڑی سے موٹر گاڑی اور پھر ریل سے ہوائی جہاز ہماری تہذیب کو مسلسل ترقی کی جانب لے جارہے ہیں۔ زراعت اور صنعت کے شعبوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ہماری ضروریات بڑھنے کے ساتھ ذرائع پیداوار میں بھی تبدیلی ہوئی ہے مگر یہ کیفیت ثقافت میں نہیں

ہوتی۔علامہ اقبال اور غالب کے کلام کو ہم جدید کلام کی نسبت سے کم تر نہیں کہہ سکے۔مغلیہ فن تعمیر کو جو اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے جدید فن تعمیر اس کا کسی لحاظ سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔لہذا قدیم اور جدید ثقافت کا موازنہ کر کے ہم ایسا کوئی معیار مقرر نہیں کر سکتے جس سے ثقافت کی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکے۔

۳۔ تہذیب میں بین الاقوامیت کا عنصر غالب ہے جب کہ ثقافت پر علاقے کی چھاپ ہوتی ہے۔تہذیب کا تقاضا ہے کہ ہم کپڑے پہنیں، پکا ہوا کھانا کھائیں، ریل میں سفر کریں، ٹریکٹر استعمال کریں۔بجلی سے حرارت پیدا کریں، مشینوں اور آلات کی مدد سے اپنی پیداوار میں اضافہ کریں مادی دنیا میں انسان ان ایجادات اور نعمتوں سے مشترکہ طور پر مستفید ہوتے ہیں لیکن ہر علاقے کی ثقافت الگ الگ ہے۔مغربی اور مشرقی معاشرے کی اقدار مختلف ہیں۔غریب اور امیر لوگوں کی طرز زندگی میں نمایاں فرق ہے۔پہاڑی اور میدانی علاقوں میں بسنے والوں کی ثقافت میں فرق ہے۔

۴۔ تہذیب کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور دیکھ کر اس کی افادیت کا اندازہ لگا سکتا ہے مثلاً ٹرانسپورٹ کی افادیت سے کون واقف نہیں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل سب کی نظر میں مفید اشیاء ہیں لیکن ثقافت کو سمجھنے کے لیے ذوق نظر چاہیے۔شاعری، ادب، مصوری اور آرٹ، کو ایک فنکار ہی سمجھ سکتا ہے۔ہر شخص ان لطیف خیالات سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

۵۔ تہذیب کو دیکھا جا سکتا ہے اس کو ناپا تولا جا سکتا ہے اس کی قیمت مقرر کی جا سکتی ہے لیکن ثقافت کی کیفیت اور ہے۔اس کا تعلق جذبات اور احساسات سے ہے۔لہذا ثقافت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ایک پینٹنگ کی قدر و قیمت کا اندازہ محض دیکھنے یا چھونے سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اس فن کی باریکیوں اور رعنائیوں کو محسوس کرنے ہی سے اس کا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔فرانس میں مونالیزا کی نادر پینٹنگ کی قیمت لاکھوں ڈالر پڑی ہے۔

تہذیب اور ثقافت کا باہمی تعلق

تہذیب اور ثقافت زندگی کے دو پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں جس طرح جسم اور روح کے رشتہ کے بغیر متوازن زندگی کا تصور محال ہے۔ اسی طرح تہذیب اور ثقافت باہمی طور پر مربوط ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار ہیں دونوں کی مماثلت کو حسب ذیل سطور میں واضح کیا جاتا ہے۔

۱۔ تہذیب کے بغیر ثقافت کی نشو ونما نہیں ہو سکتی تہذیب ہماری زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرتی ہے۔ جسم آسودہ ہو تو ذہن غور وفکر کر سکتا ہے اور زندگی کے حسن و قبح کو اجاگر کر سکتا ہے۔ ایک فنکار اگر زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے تو وہ اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرنے میں دقت محسوس کرے گا۔ لہذا تہذیب ایسا ماحول پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے جس میں ثقافت کی نشو ونما ہوتی ہے۔

۲۔ تہذیب ایسے ذرائع فراہم کرتی ہے جن سے ثقافت کو پھیلایا جا سکتا ہے مثلاً چھاپہ خانہ، ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے کتابوں اور رسالوں کی اشاعت آسان ہوگئی اور اس طرح خیالات اور نظریات کو [illegible] دل تک منتقل کرنے میں آسانی پیدا ہوئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی ان نظریات اور تصورات کی نشر و اشاعت میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ دنیا کے ایک گوشے میں بسنے والے لوگ دوسرے گوشے کے لوگوں کے ذہن اور سوچ کو بخوبی دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہم اپنی اور دوسروں کی ثقافت کو کہانی اور ڈرامے کے ذریعے دلچسپ انداز میں سمجھ سکتے ہیں اور ہمارے دل و دماغ پر گہرے تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۳۔ تہذیب نے ہمیں فراغت عطا کی ہے وگرنہ غیر مہذب دور میں انسان صبح سے شام تک فکر روزگار میں سرگرداں رہتا تھا مگر مشینوں کی ایجاد سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ چیزیں تیار ہونے لگی ہیں جس کے باعث انسان کو فراغت میسر آئی ہے۔ فراغت کے لمحات میں وہ ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور روح کے لیے غذا

فراہم کرتا ہے۔ آرٹ اور فنون لطیفہ کی تخلیق کے لیے فرصت اور سکون چاہیے۔ تہذیب کی بیشتر ایجادات سے ہماری تکالیف اور مشکلات میں کمی واقع ہوئی ہے جو ثقافت کی نشو ونما کے لیے ممد ومعاون ہے۔

۴۔ ہماری تہذیب نے ان گنت اشیاء تیار کی ہیں جن کی کھپت کا انحصار ہماری مانگ پر ہوتا ہے لیکن ہم اشیاء کو حاصل کرتے وقت اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ پسند اور ناپسند ہماری ثقافت ہے لہٰذا ان اشیاء کی تیاری پر ہماری ثقافت کا اثر ہوتا ہے اور ان کی بناوٹ، رنگ، نقش و نگار اور شکل و شباہت کو ثقافتی انداز سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ گویا ایک چیز ہماری ضرورت بھی پوری کرتی ہے جو تہذیب کی علامت ہے اور ہمیں مسحور بھی کرتی ہے جو ہمارے ذوق وشوق کی علامت ہے یہ ذوق وشوق ہی ثقافت کا مظہر ہے۔

۵۔ تہذیب نے انسانوں کے درمیان فاصلہ کم کر دیا ہے ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے ہونے لگا ہے۔ دنیا سکڑ رہی ہے اور انسان ایک وحدت نظر آنے لگے ہیں۔ تہذیب کے اس کرشمہ نے تمام علاقائی تقاضوں کو ایک ہمہ گیر ثقافت میں ضم ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اب مغربی طرز زندگی ہماری معاشرت میں جگہ پا رہی ہے اور مشرقی افکار کو مغرب میں پذیرائی ہو رہی ہے۔ مختلف اقوام کے آپس میں قریب آنے سے ہماری تہذیب و ثقافت ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔

پاکستانی ثقافت

ہندوستان میں مسلمان صدیوں سے آباد ہیں۔ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو ہندوستان کے اصل باشندے تھے۔ دراوڑ اور وہ لوگ بھی ہیں جو باہر سے آ کر آباد ہوئے۔ مثلاً آریائی، مغل، ترک، عرب، یونانی اور افغان۔ ان میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ مسلمان کہلائے اور ان کی طرز زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گزرنے لگی۔ اسلام صرف ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام نے کچھ چیزوں کو ترک کرنے کی ہدایت کی ہے اور

کچھ کو اپنائے رکھنے کی اجازت دی۔اس نقطہ سے پاکستانی ثقافت کا آغاز ہوتا ہے گویا پاکستانی ثقافت ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔اس میں رسم و رواج اور قدیم نظریات بھی شامل ہیں اور جدید تصورات اور روحانی اقدار کا بھی حصہ ہے پاکستانی ثقافت کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔ [۷]

۱۔ قدامت پسندی

پاکستانی قوم بہت سی قدیم رسومات کی پابند ہے مثلاً شادی بیاہ کے رسم و رواج، جہیز اور ذات برادری۔یہ تمام رسوم ہندو سوسائٹی کی پیداوار ہیں مگر بدقسمتی سے پاکستانی ثقافت کا حصہ بن چکی ہیں۔

۲۔ سادگی

پاکستانی ثقافت میں سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔تصنع اور بناوٹ کو پسند نہیں کیا جاتا۔غریب اور متوسط طبقہ کا لباس، خوراک اور رہائش سادہ ہے البتہ امراء کا طبقہ مغربی طرز زندگی کی طرف مائل ہے۔پاکستانیوں کی بیشتر آبادی دیہاتی زندگی بسر کرتی ہے۔

۳۔ روحانیت

پاکستانی اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی ثقافت میں وحدانیت اور رسالت کا تصور موجود ہے۔ اسلامی شعائر کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور غیر اسلامی تحریکوں کو ناپسند کرتے ہیں۔پاکستان میں شیعہ، سنی مشہور فرقے ہیں۔صوفیاء اور اولیاء کرام سے پاکستانی خاص عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے عرس وغیرہ جوش و خروش سے مناتے ہیں۔

۴۔ مہمان نوازی

پاکستانی بڑے مہمان نواز ہیں ان کے گھر جو آ جائے اس کی خاطر تواضع کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور حتیٰ المقدور اس کی عزت افزائی کرتے ہیں۔

۵۔ عورت کا احترام

پاکستانی معاشرہ میں عورت کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ماں کے قدموں میں جنت کے تصور کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

۶۔ غریب پروری

پاکستانی غریبوں، فقیروں اور یتیموں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور خیرات دے کر مسرت محسوس کرتے ہیں۔ مختلف تہواروں پر نذر و نیاز دینا ان کی ثقافت کا حصہ ہے۔

۷۔ خوراک

پاکستانی قوم کی پسندیدہ غذا گوشت اور مرغن کھانے ہیں۔ وہ طرح طرح کے کھانوں کے شوقین ہیں اور ان کا دسترخوان بڑا وسیع ہوتا ہے۔

۸۔ موسیقی

پاکستانی موسیقی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ انہیں ایسی موسیقی پسند ہے جس میں درد اور سوز ہو، قوالی ان کا مقبول راگ ہے۔

۹۔ اجتماعیت

پاکستانی ثقافت میں اجتماعیت کا عنصر نمایاں ہے۔ شادی بیاہ اور خوشی کی دیگر تقریبات میں تمام عزیز و اقارب اور احباب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح رنج و غم کے موقعوں پر بڑا اکٹھ ہوتا ہے اور کئی روز تک سوگ منایا جاتا ہے۔ مغربی ثقافت میں نفسا نفسی کی کیفیت ہے اور کوئی کسی کا مونس و غمگسار نہیں جب کہ ہمارے ہاں دوسروں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری عبادت میں بھی اجتماعیت کا تصور واضح ہے۔ تہوار، میلے، عرس اور سماع کی محفلیں اجتماعیت کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔

کیا موئن جودڑو، ہڑپا اور ٹیکسلا کی تہذیبیں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں؟

اس امر پر تو تقریباً سارے پاکستانی متفق ہیں کہ ہم یقیناً ایک قدیم ثقافت کے وارث ہیں لیکن یہاں شروع سے ایک مکتب خیال موجود ہے جو مذکورہ بالا تہذیبوں کو پاکستانی ثقافتی ورثہ سمجھتا ہے اور اس نظریہ کو عام کرنے کے لیے اسی طرح کوشاں ہے جس طرح ایران کے بعض لوگ عہد زرتشت اور جمشید اور مصر کے بعض لوگ عہد فراعینہ کی تہذیبوں کو اپنا صحیح اور کلی ثقافتی ورثہ سمجھتے ہیں اور اسلامی دور اس کے شاندار کارناموں اور اس کی تہذیبی فتوحات کو ایک افسوسناک مداخلت سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا خیال رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تو نہیں لیکن جو لوگ اس کے مبلغ ہیں وہ بڑے بااثر اور بارسوخ ہیں اور ملک کے ثقافتی ڈھانچے کو بدل کر اپنے رنگ میں ڈھالنے کے لیے زبردست جہاد کر رہے ہیں۔

یہاں ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ موئن جودڑو، ہڑپا، ٹیکسلا اور اس طرح کے کچھ اور قیمتی تہذیبی آثار ہمارے ملک میں موجود ہیں ہم یقیناً ان کے مالک ہیں اور ہمیں اس بات پر خوشی اور فخر بھی ہے کہ زمانہ ماقبل تاریخ میں ایسی شاندار تہذیبیں زمین کے اس خطہ میں ابھریں اور پروان چڑھیں جس میں آج ہم بستے ہیں لیکن تاریخی طور پر ان تہذیبوں سے ہمارا کبھی واسطہ نہیں رہا۔ نہ ہی انہوں نے ایسی ادبی یا فکری یادگاریں چھوڑیں جن کے دھندلے سے نشانات بھی ہمارے موجودہ ثقافتی ورثے میں ڈھونڈے جا سکتے ہوں۔ یہ درست ہے کہ اسلام کی آمد سے بھی پہلے ہمارے آباؤ اجداد اسی خطے میں آباد تھے اور ان کی ثقافت بلاشبہ ان کے اسلاف کے فکر و ادب سے متاثر بلکہ متشکل ہوئی ہوگی۔ لیکن اسلام سے بہت پہلے وہ تہذیبیں اور ان کے نام بھی مٹ چکے تھے اور اگر ہمارے باپ دادا میں غیر شعوری طور پر ان کے کچھ آثار موجود تھے تو اسلام کی نہایت اعلیٰ اور طاقتور ثقافت اس طرح ان پر غالب آگئی کہ اب ریسرچ سے بھی ان کا پتہ نہیں چل سکتا۔ خلاصہ یہ کہ عقلی یا تاریخی

طور پر ہم ہرگز یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہم وادی سندھ کی تہذیب کے باقیات صالحات ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں پاکستانی ثقافت پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ دوسری افراط کی نمائندگی کرتی ہیں، ان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس وقت پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں جو تہذیبی انتشار اور بے راہروی ہے ہمارا ثقافتی ورثہ ہے۔ دراصل یہ خیال رکھنے والے لوگ کسی ورثہ کے قائل نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کے لوگ جس طرح وہ بس رہے ہیں اور جو ان کے احساسات جذبات تمنائیں اور عزائم ہیں وہ ہی ان کی ثقافت ہے۔ اسی خیال نے چار قومیتوں کا نظریہ پیدا کیا ہے جو اسلام اور پاکستان دونوں کی دھجیاں بکھیرنے پر تلا ہوا ہے۔

پاکستان کا ثقافتی ورثہ

ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم اسی ثقافت کے وارث ہیں جو پہلے محمد بن قاسم اور عرب فاتحین کے ساتھ اور پھر مسلم افغانوں، ترکوں اور ایرانیوں کی قیادت میں یہاں آئی تھی۔ اس ثقافت نے یہاں بہت نشیب و فراز دیکھے۔ آج تک اس پر اسلام کی مہر ثبت ہے۔ اسی لیے مسٹر گاندھی کے ساتھ ایک مشہور مذاکرہ میں مسٹر جناح نے ایک الہامی لمحے میں مسٹر گاندھی کو بتایا کہ دین وعقائد، تاریخ وتمدن، رسم و رواج، احساسات و جذبات، فکر و ادب، غرضیکہ ہر زاویہ نگاہ سے مسلمان ہندوؤں سے ممیز ایک علیحدہ قوم ہیں۔ قائداعظم نے ایک جملے میں ہمارے ثقافتی ورثہ کی بہترین تصویر کھینچی تھی۔ اس وقت اس تصویر پر کسی نے شک نہیں کیا تھا لیکن آج کافی لوگ اسے پہچاننے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ تاریخ کانفرنس بہت مناسب وقت پر ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ کانفرنس کے شرکاء اس موضوع کی مکمل اور صحیح وضاحت کریں گے۔ ہم بھی مختصراً اپنے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ [8]

اسلامی عقیدے اور شریعت کی حکمرانی

پاکستان اس آزاد اسلامی دنیا کے مشرقی سرے پر واقع ہے جس کے مغربی کنارے پر مراکش ہے۔ پہلے

مشرق میں یہ سلسلہ ہندوستان سے گزرتا ہوا انڈونیشیا تک پہنچتا تھا۔ لیکن اب ہندوستان میں اسلام مغلوب ہے۔ اس کے باوجود افریقہ اور ایشیا کے اس طویل اور عریض خطے میں ابھی تک اسلامی ثقافت کی فرمانروائی ہے جو بنیادی طور پر ہر جگہ ایک ہے۔ اور اس کی وحدت کا ضامن اسلام کا عقیدہ اور اس کی شریعت ہے۔ اگرچہ اسلام پر پورا عمل کہیں نہیں ہے لیکن اس پر عمل کرنے کی آرزو ہر جگہ ہے۔ تمام مسلم اقوام عالم کا آئیڈیل بھی یہی ہے اور کم از کم نجی اور شخصی زندگی میں دنیا کے تمام مسلمان ایک شریعت کے پابند ہیں۔ جزوی اختلافات کو چھوڑ کر عبادات اور مذہبی رسوم کے طریقے ہر جگہ یکساں ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام

کسی دین کا سب سے بڑا مظہر اس کا اخلاقی نظام ہوتا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے۔ اس اعتبار سے بھی پوری اسلامی دنیا میں حق و باطل، جائز و ناجائز، حلال و حرام، اور پسندیدہ و ناپسندیدہ کا ایک ہی معیار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک قوم کا زہر دوسری قوم کی خوراک ہو۔ جو نائیجیریا، الجزائر، ترکی، اور انڈونیشیا میں زہر ہے وہ پاکستان میں بھی زہر ہے اور جو وہاں خوراک ہے وہی یہاں خوراک ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر دور اور ہر ملک کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان کی رعایت ضروری ہوتی ہے لیکن اسلام میں اتنی لچک ہے کہ ان تقاضوں کو پورا کر سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے اخلاقی نظام کو توڑ کر ہی ان تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ پاکستان کی اکثر آبادی اس اخلاقی نظام کو اپنا ثقافتی ورثہ سمجھتی ہے اور اس پر چلنا چاہتی ہے خواہ اس کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر اسلامی نظام اخلاق ہے کیا تو ہم عرض کریں گے کہ ہر مسلمان مجموعی طور پر اس سے واقف ہے تاہم چونکہ بعض حضرات دانستہ طور پر اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں اس لیے ہم اس نظام کی

صرف وہ خصوصیات پیش کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں عملاً موجود ہیں اور جن کے بارے میں بہت کم لوگوں کو اختلاف ہے۔

۱۔ سب سے بڑا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ جس بات کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے اس کا ماننا ضروری ہے اور جس چیز سے روکا ہے اس سے رکنا ضروری ہے۔ جس کو معروف کہا وہ معروف ہے جس کو منکر کہا ہے وہ منکر ہے اور ہمارے نزدیک وہی خیر و شر ہے جس کو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے خیر و شر کہا ہے۔

۲۔ اسلامی اخلاق کا دوسرا بنیادی اصول خدا کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ ہے۔ یعنی انسان کو اپنے تمام اعمال کے لیے ایک دن خدا کے آگے جواب دینا پڑے گا۔ اس لیے خیر و شر کے انتخاب میں اسے صرف حکومت اور معاشرے سے نہیں ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بڑھ کر اس خدا سے ڈرنا چاہیے جو سب کچھ دیکھتا ہے، سنتا اور جانتا ہے۔

۳۔ اسلامی اخلاق کا آخری معیار خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے انسانی ضمیر کی آواز نہیں ہے۔ ضمیر کی آواز صحیح ہوتی ہے اور غلط بھی۔ وہ بسا اوقات دھوکہ دیتی ہے اس لیے اسے تائیدی حیثیت تو حاصل ہے مگر اسے آخری حکم نہیں بنایا جا سکتا۔

۴۔ اسلام نے یہودیت کی طرح انسانی اخلاق کی تفصیلی گرامر نہیں مرتب کی ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ اللہ کا رسول ﷺ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ پیغمبر ضمیر امتاں را ہی کند پاک۔ وہ انسانوں کے دلوں کو پاک کر کے ان کو خیر و صلاح سے بھر دیتا ہے اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دنیا میں جو بھی عمل کریں صحیح کریں۔ خیر و شر کی تمیز بھی انسانوں کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد بھی یہی تھا۔ آج پوری انسانیت اس امر پر متفق ہے کہ دنیا میں عدل اور قانون کی فرمانروائی اسی وقت قائم ہو سکتی ہے

جب لوگوں کے دل پاک ہوں یعنی وہ خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر حق کو حق کہیں اور باطل کو باطل مگر ضمیر کی آواز اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب وہ پاک ہو۔ اجتماعی ذمہ داری کا احساس اسی پاکی دل سے پیدا ہوتا ہے۔ آج ہمارے دل پاک ہوتے تو ہم پر صوبائی اور علاقائی عصبیت کا بھوت سوار نہ ہوتا۔ نہ بنگلہ دیش وجود میں آتا نہ چار قومیتوں کے نعرے بلند ہوتے نہ اہل دولت غریبوں کو کھانے کو دوڑتے نہ غریب بغاوت پر آمادہ ہوتے۔ نہ چند افراد مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنی بادشاہت کا خواب دیکھتے اور نہ عوام ہر طرز حکومت سے بیزار و بدگمان ہوتے۔

۵۔ اسلام کا مقصد ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا ہے جو اجتماعی عدل پر مبنی ہو۔ جہاں لوگوں کو اپنے حقوق اور فرائض کا صحیح احساس ہو اور یہ احساس جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے صرف پاکی ضمیر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے محض آخرت کا عقیدہ کافی نہیں دنیا کا مادی ماحول بھی پاک ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ معاشرے کی اصلاح و تنظیم کے لیے اسلام نے ایک اہم اخلاقی اصول یہ دیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اور بے تکلفانہ اختلاط نہ ہو ورنہ فساد کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتیں ملفوف ہو کر باہر نکلیں یا کھیتوں اور کارخانوں میں کام نہ کریں یا ان پر کوئی خاص پابندی عائد کی جائے ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت تمام اخلاقی قیود اور حدود توڑ کر بیباکی سے ایک دوسرے سے نہ ملیں ورنہ اس سے وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو مغرب اور خصوصاً امریکہ میں برآمد ہوا ہے۔ جہاں جنس ہر چیز پر غالب ہے جنسی جرائم اپنے انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں اور باوجود اس حیرت انگیز مادی ترقی کے امریکہ کا معاشرتی اور خانگی نظام بری طرح درہم برہم ہے۔

۶۔ اسی طرح حیاداری اسلامی اخلاق کا ایک بنیادی اصول ہے۔ جن قوموں نے بے حیائی خصوصاً جنسی بے حیائی اور عریانی اختیار کی بہت جلد اپنے انجام کو پہنچیں۔ آج کل آرٹ اور فنون لطیفہ کے نام پر مغرب میں بڑے پیمانے پر اس بے حیائی پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے ہمارے ملک میں بھی آرٹ اور فن کے بہانے

حیاء کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے اور اس کا خوبصورت انجام ہمارے سامنے ہے۔ ہماری نئی نسل ہمارے اخلاقی ورثہ کو پیچھے چھوڑ چکی ہے اور پرانی نسل بھی بڑی حد تک چھوڑنے پر بے چین نظر آتی ہے۔

۷۔ اسلام نے تمام منشیات کو حرام قرار دیا ہے۔ آج دنیا میں جرائم کے دو سب سے بڑے سرچشمے جنس اور منشیات ہیں۔ یہ اسی اسلام کا احسان ہے کہ اپنی عام پسماندگی کے باوجود اسلامی دنیا ابھی تک ان جرائم سے نسبتاً بڑی حد تک پاک ہے۔

علم و ادب

مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک مہذب دنیا پر سیاسی علمی اور تمدنی فرمانروائی کی۔ اس عرصہ میں تمام علوم وفنون کے وہی مالک تھے۔ انہوں نے علم کی نئی راہیں کھولیں۔ نئے تجربات کیئے۔ نئے علوم مدون کیے۔ ہزار ہا کتابیں لکھیں اور دنیا کے علمی خزانے کو اپنے کارناموں سے معمور کیا۔ یہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن ہم فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ تمام کام ہمارا ثقافتی ورثہ ہے۔ اس عظیم کام میں جس طرح عرب ایران، مصر، شمالی افریقہ، ترکی، وسط ایشیا انڈونیشیا کے مسلمان شریک ہیں اسی طرح ہندوپاک کے علماء بھی اگر ان علوم اور کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ ان سب میں ایک ہی طرز فکر کار فرما ہے اور تقریباً ایک ہی تمدن کی عکاسی ہے۔ مثلاً کوئی کتاب الجزائر یا ترکی کے تمدنی حالات پر لکھی گئی ہو تو وہ آسانی سے پاکستان یا انڈونیشیا کے حالات پر منطبق ہو سکتی ہے کیونکہ مقامی اختلاف سے قطع نظر، بنیادی طور پر تمام اہل علم وفن کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے ان کی یادگاروں کو زندہ رکھتے ہیں ان کے دن مناتے ہیں ان کے نام سے اپنی ثقافتی اور قومی ادارہ کو منسوب کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا کے باہر یہ بات کہیں نہیں ملے گی مثلاً برطانیہ میں فرانس کے کسی جنرل ادیب یا مفکر کی کوئی یادگار نہیں ملے گی اور نہ ہی انگریز اس پر فخر کرے گا حالانکہ دونوں ملک عیسائی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا ثقافتی ورثہ مشترک نہیں ہے۔

افکار ونظریات

دین وشریعت اخلاق و آداب، علوم وفنون، فلسفہ وحکمت اور سیاست ومعیشت کے بارے میں پوری اسلامی دنیا میں ایک ہی جیسے افکار ونظریات پائے جاتے ہیں ہم نہیں کہتے کہ یہ سب صحیح یا قیمتی ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ اسی لیے مسلم علماء ومفکرین کے خیالات ونظریات ایک جیسے رہے ہیں اوران کا طرزفکر بھی ایک ہے ہم اس طرز فکر کے وارث ہیں اوران فکری کارناموں کے بھی جو اس فکر کا نتیجہ ہیں۔ یوں تو صحیح علم و فن اور صحیح افکار ساری دنیا کی میراث ہیں لیکن یہاں یہ بحث نہیں ہے بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ اسلامی ذہن واخلاق اور معاشرت وتمدن سے متاثر ہوکر جوافکار ونظریات ظاہر ہوئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ ملکت اسلامیہ کی میراث ہیں اوراس ملت میں ہم بھی شریک ہیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم مفکرین کے تمام افکار ونظریات کوہم اپنا ثقافتی ورثہ نہیں سمجھتے اس لیے کہ ان میں ایسے افکار بھی بہت ہیں جو دینی واخلاقی یا علمی وعقلی اعتبار سے درست نہیں اوراس لیے بھی کہ ورثہ میں ہمیشہ یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ صالح ونفیس ہے۔

سیاست ومعیشت

اجتماعی زندگی کے ان اہم شعبوں میں بھی اسلامی تمدن کی اعلیٰ روایات موجود ہیں جو ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں۔ سب کومعلوم ہے کہ طرز حکومت تو ایک وقتی چیز ہے۔ حالات کے اعتبار سے وہ بدلتی رہتی ہے۔ دنیا میں عرصہ دراز تک شخصی نظام رائج رہا۔ صرف پچھلے دوسوسال یا یوں کہیے کہ انقلاب فرانس کے بعد سے جمہوریت کا دور دورہ ہوا ہے مگر مورخین کا خیال ہے کہ کمیونسٹ ریاست کا قیام جمہوریت سے بھی آگے ایک قدم ہے۔ خصوصاً چین کی جمہوریت پر آج تمام عالم رشک کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں اصل اعتبار قیام عدل کا ہے۔ نوع حکومت کا نہیں اس لحاظ سے

آج کل کی بہت سی جمہوریتیں قرونِ وسطیٰ کی شخصی حکومتوں سے یقیناً بدتر ہیں۔ لہٰذا ہم جب اسلامی دنیا کی گزشتہ سیاست کو سراہتے ہیں تو بنوامیہ، بنوعباس یا افغانوں، مغلوں اور ترکوں کی شخصی حکومتوں کی تعریف کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے دور میں کہاں تک عدل قائم ہوا۔ اور اس کا کیا معیار تھا۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً زمانہ حال تک مسلم ریاستوں میں عدل کا معیار باقی دنیا کی نسبت زیادہ بلند رہا ہے۔ اس معاملہ میں مذہب و نسل کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا نہ ہی امارت و غربت یا جاہ و منصب سے عموماً عدل متاثر ہوا۔ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ جو عادلانہ اور فیاضانہ سلوک ہوا اس کی مثال آج بھی دنیا کی کوئی غیر مسلم ریاست نہیں پیش کر سکتی۔ شخصی اور ضمیر کی آزادی کا بھی مسلم ریاستوں نے ہمیشہ بہترین نمونہ پیش کیا البتہ جب یہ آزادی سیاست میں ملوث ہوئی تو سلب کر لی گئی اور یقیناً ظلم ہوا ہے اور یہ ظلم ہمارا ورثہ نہیں ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد پھر کبھی کوئی جمہوری تحریک اسلامی معاشرے میں نہیں اٹھی بلکہ خود خلافت راشدہ بھی تشکیل اور اپنے ڈھانچہ کے اعتبار سے پوری طرح جمہوری نہیں تھی۔ اگرچہ اپنی روح میں یقیناً جمہوری تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے کوئی متعین دستور نہیں دیا ہے۔ مسلمان ہر دور میں اپنے خیالات کے لحاظ سے جو بھی دستور مناسب سمجھیں بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اس زمانے میں اگر ہم جمہوری یا کوئی اور طرز حکومت اختیار کریں تو کوئی دینی یا شرعی مانع نہیں ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلم بادشاہوں کا شخصی اور موروثی نظام ہمارا ثقافتی ورثہ نہیں۔ ان کا عدل، ان کی فیاضی، ان کی رواداری، بندگان خدا کی خدمت، اہل مذاہب کے ساتھ منصفانہ سلوک، رعایا کی خوشحالی کا اعلیٰ اہتمام اور ظلم کا استحصال یہ چیزیں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں۔

معیشت کے باب میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلم ریاستوں میں عام طور اسلامی قانون رائج رہا اس لیے حرام اشیاء کی تجارت اور کاروبار کے ناجائز طریقے ہمیشہ ممنوع رہے۔ زرمبادلہ کمانے یا ٹیکس وصول کرنے کے لیے

ناجائز اشیاء کی صنعت یا تجارت کی کبھی اجازت نہیں ملتی تھی۔ موجودہ حکومتوں کے لیے یہ ایک عمدہ سبق ہے اگر وہ اپنے ماضی سے کچھ حاصل کرنا چاہیں تو۔

ثقافتی ادارے [۹]

دنیا میں وہی معاشرہ قائم اور زندہ رہتا ہے جو اپنا بقا اور ترقی کے لیے کچھ مستقل اور پائیدار ادارے قائم کرتا ہے۔ حکومتیں اور سلطنتیں اٹھتی اور گرتی رہتی ہیں لیکن معاشرہ باقی رہتا ہے۔ دنیا میں آج ساٹھ کروڑ مسلم آبادی ہے اور یہ آبادی بڑھتی جا رہی ہے حالانکہ دنیا میں ایک بھی طاقتور مسلم ریاست موجود نہیں بلکہ بہت سوں کا تو وجود خطرے میں ہے۔ پھر اس بقا کا راز کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا سبب وہ تین عظیم الشان ثقافتی ادارے ہیں جو دنیا کی کوئی اور قوم کوئی تہذیب کوئی ریاست کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا اور وہ یہ ہیں۔

اخوت

مساوات

اسلام کی جمہوری روح

قرآن حکیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو جوڑ دیا اور اپنی نعمتوں سے نواز کر ان کو بھائی بھائی بنا دیا اور یہ کہ مسلم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے امت مسلمہ پر ایک انعام عظیم تھا۔ یہ انعام ملت اسلامیہ کی تنظیم اور وحدت کا ایک طاقتور اصول بن گیا۔ اس ملت کی برادری میں داخل ہونے کے لیے صرف اسلامی عقیدے کا قبول کرنا کافی تھا اور کسی سند کی ضرورت نہیں تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ برادری کا رشتہ تمام رشتوں پر غالب رہا۔ خود آنحضرت ﷺ کے دربار میں حبشی، رومی، ایرانی، اور مختلف قوموں نسلوں اور رنگوں کے لوگ موجود تھے اور حضور کی نظر میں ان کا مرتبہ بڑے بڑے عرب صحابہ سے بھی زیادہ بلند تھا۔ آخر بارگاہ نبویؐ میں حضرت بلالؓ سے بڑا مرتبہ کتنے لوگوں نے پایا۔

یہی کیفیت تھی خلافت راشدہ کی اور بعد کی تاریخ تو ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر چہ حضور نبی کریم ﷺ عرب میں معبوث ہوئے اور قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہوا مگر اسلامی عقیدے و شریعت کی تدوین و تشریح اور اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی آبیاری ان تمام قوموں نے مل کر کی جو اسلامی برادری میں داخل ہوئیں۔ اسلامی دنیا کی سیاسی وحدت تو بہت جلد ختم ہوگئی۔ لیکن اخوت کے اس شاندار اور طاقتور اصول نے ملت اسلامیہ کو پارہ پارہ نہیں ہونے دیا۔ بعد میں جب مسلم دنیا بے شمار آزاد ریاستوں میں تقسیم ہوگئی اس وقت بھی یہ اصول قائم رہا اور بڑی آسانی سے ایک ملک کا مسلم دوسرے مسلم ملک میں جا کر حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا تھا۔ چنانچہ ہمارے بچے بھی جانتے ہیں کہ ابن بطوطہ جو ایک مراکشی مسلمان تھا تغلق سلطنت کے زمانے میں ہندوستان آیا اور پانچ برس تک دہلی میں قاضی کے عہدے پر مامور رہا۔ یہ سلسلہ یہ رواداری یہ فیاضی یہ محبت آج بھی باقی ہے۔ مسلم حکومتوں کے دل تو ہمیشہ پاک نہیں ملیں گے لیکن عام طور پر مسلمانوں کے دل آج بھی پاک ہیں۔ چنانچہ دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو باقی مسلم دنیا اس سے ضرور غم زدہ ہوتی ہے اور اپنی حد تک اس کی مدد کرتی ہے لیکن اس برادری کا مظاہرہ شخصی زندگی میں زیادہ ہوتا ہے۔ آج ہمارے درمیان افریقہ، یورپ، امریکہ، آسٹریلیا یا کسی دور دراز خطے کا مسلمان آ جاتا ہے تو اس سے مل کر ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے اور ہم اس کی پوری مدد کرتے ہیں لیکن ایک جرمن عیسائی ایک فرانسیسی عیسائی کو دیکھ کر بالکل خوش نہیں ہوتا اور یہاں تو یہ حال ہے کہ اگر دو مسلم ملکوں کے درمیان دشمنی ہو پھر بھی ان کے باشندوں کے درمیان رشتہ اخوت منقطع نہیں ہوتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ مسلمانان عالم کی ثقافتی وحدت کی سب سے بڑی ضمانت بھی رشتہ اخوت ہے اور یہ ہمارا ایک نہایت قیمتی ثقافتی ورثہ ہے۔

اسلامی تمدن کی طاقت اور بقا کا دوسرا راز مساوات کا اصول ہے۔ جب خدا نے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ انسانوں کو یہ پیغام سنایا کہ اس کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے تو یہ انسانی

تمدن میں ایک عظیم انقلاب کا اعلان تھا۔ اس طرح جب حضورﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ بجز تقویٰ کے۔ تو یہ اس خدائی پیغام کی عملی شرح تھی۔ اس اصول کا منطقی اور تاریخ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے اندر آنے والے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے بلکہ انہوں نے معاشرے میں درجہ بھی برابر پایا۔ یعنی مسلمان بھی انسان کی حیثیت سے برابر ہیں اگر کسی کو فضیلت ہے تو صرف تقویٰ اور اخلاق عالیہ کی وجہ سے۔ خاندانی، نسلی، قبائلی اور قومی فضیلتوں کے دعوے کو اسلام نے یکسر ٹھکرا دیا اور وہ فضیلت بھی صرف عزت و احترام کی حد تک ہے حقوق کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں ہزاروں آدمی بالکل پردۂ گمنامی سے اٹھے اور اجتماعی زندگی کے اونچے سے اونچے مناصب پر پہنچ گئے اور ان کی ابتدائی بے وقعتی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔ اگر چہ برصغیر ہند و پاک میں ہندوؤں کے ساتھ رہ کر ہم بھی قبائلی عصبیت میں مبتلا ہو گئے اور بعض ان لوگوں کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا اور خو ساختہ فضیلت کو محض فریب سمجھتا ہے اور آج بھی مساوات کا اصول اسلامی دنیا میں اسی طرح کارفرما ہے جیسے پہلے تھا۔

اخوت اور مساوات کے ان اصولوں نے صرف اسلام کے باقی رکھنے میں مدد نہیں کی ہے بلکہ اس کی اشاعت میں زیادہ مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ دنیا میں صرف تین عالمی دین ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ یہودیت کا دروازہ تو عام لوگوں اور غیر یہودیوں کے لیے بند ہے کوئی غیر اسرائیلی یہودی نہیں ہو سکتا۔ عیسائیت اپنے بلند بانگ دعوؤں اور طمطراق کے باوجود قومیت، نسل اور رنگ کے طلسم نہ توڑ سکی۔ جنوبی افریقہ روڈیشیا، پرتگیزی افریقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نسلی تعصب کی بھیانک ترین مثالیں ہیں۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں کوئی غیر سفید نسل کا آدمی آباد نہیں ہو سکتا۔ یورپ اور مغرب کے تمدن میں غیر سفید لوگوں کو بالعموم نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور تمام امور میں ان سے امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر اسلام کی ہلکی سی صحیح آواز بھی کہیں پہنچی ہے تو غیر مسلم

اقوام نے اس پر لبیک کہا ہے۔ اس کی اعلیٰ مثال افریقہ ہے جہاں عیسائی تبلیغی ادارے اربوں ڈالر سالانہ ضائع کرتے ہیں لیکن مشکل سے عیسائی کوئی ہوتا ہے لیکن ہر سال کافی تعداد میں وہاں کے لا مذہب لوگ اسلام پر ایمان لاتے ہیں حالانکہ کوئی منظم اسلامی تبلیغی ادارہ وہاں کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اخوت اور مساوات کی نعمت بلا امتیاز سب کو حاصل ہے تو اس کو بہت بڑی رحمت سمجھ کر اس میں فوراً داخل ہو جاتے ہیں۔

تیسرا اصول اسلام کی جمہوری روح ہے۔ عبادات، اسلامی قانون، رسوم و شعائر، مجالس و تقاریب، تعلیم و تدریس غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جمہوریت کی روح کارفرما ہے مثلاً عبادات سے کوئی بالغ مستثنیٰ نہیں۔ قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہے۔ حقوق کے معاملے میں کسی کو ترجیح نہیں۔ نماز کا امام ہر مسلمان ہو سکتا ہے وہ عالم ہو یا ان پڑھ ہو۔ حج میں مسلمانوں کا ایک عالمی اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں ہر مسلم شریک ہو سکتا ہے۔ زکواۃ کا ادارہ بنیادی طور پر اجتماعی ادارہ ہے جس کا مقصد طبقات کے مالی فاصلے کو کم اور ختم کرنا ہے۔ دینی مدارس میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بہت معمولی خاندان کے لوگ اپنے علم و فضل کی وجہ سے شیوخ کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں اور لوگوں کے مخدوم بن جاتے ہیں لیکن بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلامی سیاست میں جمہوری روح کامیاب نہیں ہو سکی اس کے برعکس مغرب میں جمہوریت سیاست میں زیادہ کامیاب ہوئی لیکن شخصی زندگی میں اسے اتنا رسوخ حاصل نہیں ہوا اور عالمی سطح پر مغربی جمہوریت کی بنیاد یعنی عیسائیت بالکل ناکام رہی۔

ہماری سیاست میں جمہوریت کیوں نہیں آ سکی یہ تحقیق ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ فی الحال تو ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اخوت، مساوات اور اسلام کی جمہوری روح نے اپنے باہمی عمل سے اسلام کے عالمی معاشرے کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ صرف یہی عمل اس کی بقا اور فروغ کا ضامن ہے اس لیے یہ تینوں

ادارے ہمارے بہترین ورثہ ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمیں اس بات سے بالکل انکار نہیں کہ ثقافتوں کے ارتقاء اور تشکیل پر جغرافیائی اور مخصوص تاریخی حالات اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر ثقافت نئے ماحول میں جا کر کچھ نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کہ مقامی ثقافت میں بعض چیزیں عمدہ اور نفیس ہوتی ہیں جن کو غالب ثقافت اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یہ اختلاط اور امتزاج یقیناً مستحق ہے چنانچہ دنیا کے ہر خطے میں جہاں اسلام گیا جذب وانجذاب کا یہ عمل جاری ہوا اور ہر ملک کی اسلامی ثقافت میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئیں لیکن اب غور سے دیکھیں تو امتیازات سطحی نظر آئیں گے اپنی اصل اور جوہر میں اسلامی ثقافت سارے عالم میں ایک ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر جمیل احمد، رہبر شہریت، اردو بازار چوک، لاہور، ۲۰۰۴۔۲۰۰۳ء، ص ۳۷۷۔

۲۔ پروفیسر عبدالغفور رفیق، آئینہ شہریت، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۰۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۹۱۔

۴۔ پروفیسر جمیل احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۳۷۸۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۸۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۳۸۱۔

۷۔ پروفیسر رحمٰن اللہ چوہدری، آئینہ مطالعہ پاکستان، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۲۔

۸۔ پروفیسر عبدالحمید تگہ، جدید عمرانیات، اولیس بک سینٹر، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۶۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔